پروفیسر محمد ایوب قادری

ندوۃ العلماء

ایک علمی و فکری تحریک

برعظیم پاک و ہند میں انگریزی حکومت کو جس قدر استقرار نصیب ہوتا گیا، اسی رفتار سے مغربی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی گرم بازاری ہونی شروع ہوئی۔ شروع شروع میں مسلمانوں نے انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تحصیل سے احتراز برتا مگر آہستہ آہستہ زمانے نے ان کو مغربی علوم کی تحصیل پر مجبور کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہ سیلاب اتنی تیزی سے بڑھا کہ جدید تعلیم و تہذیب کے سامنے پرانے علوم و فنون نہ ٹھہر سکے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد تو اس سیلاب کی لپیٹ میں پورا ملک آگیا اور پرانا نظامِ تعلیم و تہذیب کلی طور سے منتشر ہو گیا۔

انگریزی زبان اور مغربی علوم و فنون نے نئی نسل کے افکار و خیالات کو بھی متاثر کیا۔ اس کو اپنے مذہب و ثقافت سے بُعد اور آہستہ آہستہ نفرت شروع ہو گئی۔ جدید علوم و افکار کے سامنے قدیم علوم و افکار نہ ٹھہر سکے۔ مغربی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کے غلبے کے ساتھ ساتھ ملک میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے بھی میدان ہموار ہو گیا۔ عیسائی مشنریوں نے بڑے جوش اور تندہی سے عیسائیت کی تبلیغ کی۔ اس سلسلے میں اُن کو بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طرح حکومت کی مدد بھی ملتی تھی۔

حکومت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی میدان میں بھی کوئی نمایاں برتری حاصل نہ تھی۔ قدیم طرزِ تعلیم اور علوم و فنون بھی اب زمانے کے موافق نہ تھے۔ علما پرانے طریقۂ تعلیم و تدریس اور قدیم نصاب کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور ملک میں چند نجی منتشر مذہبی ادارے اور درس گاہیں قائم تھیں۔ پھر علما میں وسیع الخیالی، قوتِ برداشت اور اختلافِ رائے کے احترام کا بھی فقدان تھا۔ مختلف مذہبی گروہ اور فرقے ایک دوسرے کی نہ صرف تحقیر کرتے تھے بلکہ تکفیر کرتے تھے۔ آپس میں اتحاد و اتفاق عنقا تھا۔

ایک گروہ دوسرے کا جانی دشمن تھا۔ شیعہ سُنی، وہابی بدعتی اور مقلد و غیر مقلد کی تفریق نے مسلمانوں کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ آئے دن رسالے بازی اور مناظروں کا چرچا رہتا۔ فروعی اختلافات پر سر پھٹول ہوتا۔ ایک فریق دوسرے کو اپنی مسجد میں نہیں گھسنے دیتا۔ قبضۂ مساجد وغیرہ کے مقدمات عدالتوں میں جاتے جن کو غیر مسلم جج فیصل کرتے اور اس طرح مسلمانوں کی بہت ہوا خیزی ہوتی۔

مغربی مصنفین اور عیسائی پادریوں نے اسلام پر اعتراضات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا تھا جس سے جدید نسل متاثر ہونی شروع ہوئی۔ اگرچہ سر سید احمد خاں کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا، اور بعض دوسرے علما مثل مولوی چراغ علی وغیرہ علمی میدان میں آ چکے تھے، مگر علما جماعتی طور سے پرانے علوم کے مبلغ اور پرانے افکار کے داعی تھے۔ علما کا طرزِ تعلیم و تدریس نہ صرف قدیم تھا بلکہ نصاب کا ایک پرانا سلسلہ چلا آ رہا تھا جو جدید زمانے کی ضروریات کے لیے چنداں مفید نہ تھا۔ اس نصاب میں علمِ معقول کی کتابوں کی بھرمار تھی، نصاب میں تفسیر و حدیث اور عربی زبان و ادب کا وہ تناسب نہ تھا جو ہونا چاہیے تھا۔

اس زمانے میں بعض علما کو یہ خیال پیدا ہوا کہ پرانے طریقۂ تعلیم اور نصاب میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ۱۳۱۰ھ میں مولوی ظہور الاسلام نے ایک مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں قائم کیا جو کسی قدر پرانے طریقے سے ہٹ کر تھا۔ اسی زمانے میں مولوی محمد ابراہیم آروی نے ۱۸۹۰ء میں مدرسہ احمدیہ آرہ (بہار) میں قائم کیا اور یہ سر سید احمد خاں کی تحریک کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر تھا۔ ان مدارس میں بعض اصلاحات ظہور پذیر ہوئیں۔ نصاب کی اصلاح اور انگریزی و ہندی زبانوں کی تعلیم کے سلسلے میں تو دار العلوم دیوبند میں بھی غور کیا گیا اور بعض جزوی تبدیلیاں بھی ہوئیں مگر اس کام کے لیے ایک منظم اور باقاعدہ تحریک کا انتظار تھا اور اس کے لیے زمین تیار ہو رہی تھی، اور یہ کام خانوادہ ولی اللہی کے تربیت یافتہ عنایت احمد کاکوروی کے تلمیذ رشید مولانا محمد علی مونگیری کے ذریعے انجام پایا۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی کے واسطے سے ندوہ کی علمی، تعلیمی اور اصلاحی تحریک کا تعلق شاہ ولی اللہ دہلوی کے اسکول سے مل جاتا ہے۔ مفتی عنایت احمد، شاہ محمد اسحاق دہلوی کے شاگرد

تھے۔ انھوں نے تکمیل شاہ محمد اسحاق کے شاگرد مولوی بزرگ علی مارہروی (ف ۱۲۶۲ھ) سے کی وہ علی گڑھ اور بریلی میں صدرامین رہے۔ مفتی عنایت احمد نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لیا تھا جسکے نتیجے میں حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ مفتی صاحب نے بریلی کے قیام کے دوران میں ایک باقاعدہ انجمن قائم کی، جس کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح معاشرت تھا۔ مفتی صاحب نے اس موضوع پر متعدد اصلاحی رسالے لکھے جو انجمن کی طرف سے شائع ہوئے۔ ہمارے خیال سے ہندوستان میں مسلمانوں کی یہ سب سے پہلی اصلاحی انجمن تھی۔ جب ۱۲۷۷ھ میں مفتی صاحب جزائر انڈمان سے رہا ہوکر آئے تو انھوں نے کانپور کو اپنا مستقر بنالیا اور وہاں کے سوداگروں کی مدد سے ایک مدرسہ فیض عام کانپور جاری کیا۔ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی لکھتے ہیں:

اسی مدرسے کا فیض بالآخر ندوۃ العلما کی شکل میں عیاں ہوا۔

۱۲۷۹ھ میں مفتی عنایت احمد حج کے لیے تشریف لے گئے۔ راستے میں جہاز جدہ کے قریب پہاڑ سے ٹکرا کر ڈوب گیا۔ مفتی صاحب غریق و شہید ہوگئے۔

مفتی صاحب کے قائم کردہ مدرسہ فیض عام میں ان کے شاگرد مفتی لطف اللہ علی گڑھی نے سات سال درس دیا۔ مفتی عنایت احمد مرحوم کے ایک دوسرے شاگرد مولوی سید محمد علی تھے جنھوں نے علم کی تکمیل مفتی لطف اللہ علی گڑھی سے کی تھی اور انھوں نے مدرسہ فیض عام کانپور میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ وہ فکر کے اعتبار سے مفتی عنایت احمد سے بہت قریب تھے۔ انھوں نے بھی ایک انجمن "انجمن تہذیب" کے نام سے قائم کی، اس کا مقصد صحیح اسلامی افکار کی اشاعت و ترجمانی اور علما و جدید تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان اتحاد و اخوت پیدا کرنا تھا۔ یہی چیز ندوۃ العلما کی اساس تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے لکھا ہے

ندوۃ العلما کے قیام کا اولاً موصوف ہی کے دماغ میں خیال پیدا ہوا تھا۔ سارے ملک نے لبیک کہا۔ آج اس کے آثار ملک وملت کے سامنے ہیں۔

مولانا محمد علی نے اپنے استاذ مفتی عنایت احمد اور استاذ الاساتذہ مولانا بزرگ علی مارہروی کی پیروی میں عیسائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی اور اس پشتے کو مضبوط

کرنا چاہا جو علمائے کرام نے اس کے خلاف لگایا۔ انھوں نے ردِّ عیسائیت میں ۱۲۸۹ھ میں باقاعدہ ایک اخبار "منشور محمدی" جاری کیا۔ یہ اخبار چار۔ پانچ سال تک جاری رہا۔ اس رسالے کے مضامین اس پائے کے ہوتے تھے کہ پادری ان کے جواب دینے سے قاصر رہتے تھے۔ مولانا محمد علی نے کانپور میں ایک "اسلامیہ یتیم خانہ" قائم کیا۔ ردِ عیسائیت میں ان کی کتابیں مرآۃ الیقین، البرہان لحفاظتہ البرہان، آئینۂ اسلام، ترانۂ حجازی، دافع التلبیسات اور پیغام محمدی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۳ء میں مدرسہ فیض عام کانپور کی دستار بندی کے سالانہ جلسے کے موقع پر منتخب علما کی ایک مجلس مشاورت نے اتفاق رائے سے یہ طے کیا کہ علما کی ایک مستقل انجمن قائم کی جائے اور آئندہ سال اس کا پہلا عام جلسہ منعقد کیا جائے اور ہندوستان کے تمام ممتاز علما کو اس میں شرکت کی دعوت دی اور انجمن کا نام "ندوۃ العلما" ہوا اور مولانا محمد علی مونگیری اس کے ناظم اوّل مقرر ہوئے جو اس تحریک کے بانی اور کارپرداز تھے۔ ندوۃ العلما کے مندرجہ ذیل مقاصد طے ہوئے۔

۱۔ مغربی افکار و خیالات اور تہذیب و تمدن کا سیلاب جو مسلمانوں کو اپنی رو میں بہائے لیے جا رہا تھا اس کا مقابلہ کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کی حفاظت اور ان سے براہِ راست تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے یعنی ان کی تعلیمات کو ایسے مؤثر انداز سے پیش کیا جائے کہ لوگ ان کا زیادہ سے زیادہ اخلاقی اثر لیں اور ان کو عملاً اپنی زندگی میں نافذ کریں۔

۳۔ قدیم و جدید دونوں طریق تعلیم کی اصلاح کی جائے اور اس کا عملی تجربہ دارالعلوم ندوۃ العلما میں کیا جائے تاکہ قوم میں ایسے تعلیم یافتہ افراد پیدا ہوں جو قوم کی صحیح رہنمائی کر سکیں۔

۴۔ قدیم و جدید طبیعتوں کی اجنبیت اور علما کی گروہی عصبیت کو مٹا کر ان کے اندر اعتدال پیدا کیا جائے۔

ندوۃ العلما کے تعارف کے لیے اخبارات میں مضامین لکھے گئے۔ جلسے کیے گئے۔ ملک کے مختلف علما سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور اس مقصد کے لیے ایک شخص مولوی مشتاق علی

کو مامور کیا گیا کہ وہ ندوہ کے تعارف کے لیے ہندوپاکستان کے کچھ اہم علاقوں کا دورہ کریں۔ چنانچہ انھوں نے دیوبند، رام پور، پٹنہ، نگینہ، نجیب آباد، اٹاوہ، علی گڑھ، جھانسی، بھوپال، ملکاپور، برار، بمبئی کا دورہ کیا اور پھر وہ جدہ، مکّہ اور مدینہ پہنچے۔

ندوہ کے مقاصد میں دو باتوں پر خاص طور سے زور دیا گیا۔ اول یہ کہ عربی مدارس کے طلبا کے لیے ایسا نصاب مرتب کیا جائے جو دینی اور دنیوی اعتبار سے مفید اور جامع ہو اور اس کو تمام مدارسِ اسلامیہ میں جاری کیا جائے۔ دوم یہ کہ علما کے آپس کے نزاع اور اختلاف کو اس انجمن کے ذریعے ختم کیا جائے۔

ہندوستان کے مختلف مقامات پر اس وفد کا خیر مقدم کیا گیا جو ندوہ کے تعارف کے سلسلے میں دورہ پر گیا تھا۔ ندوہ کے قیام کو پسند کیا گیا اور مقتدر علما نے تعاون کا مکمل یقین دلایا۔ علی گڑھ میں مولانا شبلی نعمانی نے پُرزور تائید کی۔ حجاز میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ حاجی صاحب اس زمانے کے نامور شیخ طریقت، علمائے دیوبند کے روحانی رہنما اور جنگِ آزادی کے ممتاز قائد تھے۔ یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ ندوہ کو اس زمانے کے دو ممتاز شیوخ کی تائید و سرپرستی حاصل رہی جو اس کی کامیابی اور ترقی کی ضمانت ثابت ہوئی۔ اس سلسلے میں دوسرا نام مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کا ہے جو اپنے زمانے کے نامور صوفی، شیخ، عالم اور محدّث تھے۔ مولانا فضل رحمان، شاہ محمد اسحاق اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد تھے اور ندوۃ العلما کی تحریک سے وابستہ بیشتر علما ان کے حلقۂ ارادت میں منسلک تھے۔ مولانا محمد علی مونگیری ان کے مرید و خلیفہ تھے۔

ندوۃ العلما کا باقاعدہ پہلا اجلاس ۱۵ر۱۶ر۱۷ر شوال ۱۳۱۱ھ مطابق ۲۲ر۲۳ر۲۴ر اپریل ۱۸۹۴ء کو مدرسہ فیض عام کانپور کی دستار بندی کے موقع پر مفتی لطف اللہ علی گڑھی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس زمانے کے نامور علما نے اس اجلاس میں شرکت کی جن میں مولانا شبلی نعمانی (ف ۱۹۱۴) مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا محمد حسین الہ آبادی (ف ۱۹۰۵) مولوی عبدالحق حقانی (ف ۱۹۱۷) کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس اجلاس کی یہ بات بھی اہم ہے کہ اس میں مسلمانوں کے مختلف مکتبِ خیال کے علما شریک تھے۔ مثلاً اہلِ حدیث علما میں مولانا محمد ابراہیم آروی اور مولانا

محمد حسین بٹالوی اور شیعہ علما میں مولوی غلام حسین کنتوری کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔

اسی جلسے میں ندوہ کا دستور العمل منظور ہوا۔ اصلاح نصاب و مدارس سے متعلق چار تجاویز منظور ہوئیں۔ مولانا محمد علی مونگیری باقاعدہ ناظم مقرر ہوئے۔ ندوۃ العلما کے قیام کا ملک میں خیر مقدم ہوا۔ مولانا خواجہ الطاف حسین حالی نے ایک تقریر میں سراہا اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی (ف ۱۹۲۱) نے ایک رسالہ لکھ کر بھیجا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ۱۸۹۴ میں ندوہ کی حمایت میں ایک ریزولیشن پاس ہوا۔ سرسید احمد خاں نے اس ریزولیشن کی صدہا کاپیاں کانفرنس کی روداد سے علیحدہ چھپوا کر مسلمانوں میں تقسیم کیں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے ندوہ کی یہ سب سے پہلی منظم اور مؤثر حمایت تھی۔ اسی طرح انجمن حمایت اسلام نے ندوہ کی حمایت میں ریزولیشن پاس کیا بلکہ اس تحریک کا آوازہ مصر و شام تک پہنچا اور وہاں کے اخبارات نے ندوہ کی حمایت کی۔

ندوہ کا دوسرا اجلاس ۱۲/ اپریل ۱۸۹۵ کو لکھنؤ میں ہوا۔ اس اجلاس میں ندوۃ العلما کے تحت ایک دار الافتا کے قیام کی تجویز منظور ہوئی۔

مولانا محمد علی نے ندوۃ العلما کے تحت ایک دار العلوم قائم کرنے کا منصوبہ تیار کیا اور اس کا ایک مکمل خاکہ تیار کر کے ندوہ کی مجلس انتظامیہ میں ۱۲/ محرم ۱۳۱۳ھ کو پیش کیا جو "مسودۂ دار العلوم" کے نام سے مقتدر علما، اکابر اور اہلِ علم کو بھیجا گیا۔ مسودۂ دار العلوم میں مولانا محمد علی نے درجات، طریقہ تعلیم، مدتِ تعلیم، ترتیبِ علوم، طلبا و اساتذہ کے قیام اور نظام الاوقات وغیرہ کا تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ایک جامع اور عملی نقشہ پیش کیا۔ علما کی طرف سے پسندیدگی کے ہمت افزا خطوط موصول ہوئے۔ مولانا محمد علی نے ۱۴/ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۳ھ کو پہلا مجوزہ نصابِ تعلیم مجلسِ انتظامیہ میں پیش کیا۔ اس نصاب میں نئے علوم کو خاص طور سے شامل کیا گیا۔

ندوۃ العلما کا تیسرا اجلاس ۱۱/ اپریل ۱۸۹۶ کو بریلی میں منعقد ہوا، جس میں دار العلوم کا مسودہ باتفاق رائے منظور ہوا اور دار العلوم کے قیام کی تجویز منظور ہو گئی۔

اب ندوۃ العلما کی تحریک زور پکڑ گئی اور ملک میں اس کو مقبولیت حاصل ہونے لگی مختلف

مقامات دہلی اور غازی پور وغیرہ میں اس کی شاخیں قائم ہونے لگیں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے نے خاص طور سے معاونت کا ہاتھ بڑھایا لیکن بریلی کے اجلاس کے بعد سے بریلی اور بدایون کے علما کی طرف سے ندوۃ العلما کی مخالفت بڑے زور شور سے ہونے لگی۔ ان مخالفین میں سرخیل مولانا احمد رضا خاں بریلوی (ف ۔ ۱۹۲۱ء) اور مولانا عبدالقادر بدایونی (ف ۱۹۰۱ء) تھے۔ مگر ندوہ کا قافلہ آگے بڑھتا ہی رہا۔ اور طے ہوا کہ لکھنؤ میں دارالعلوم قائم کیا جائے۔ ۲ ستمبر ۱۸۹۸ کو ندوہ کا دفتر کانپور سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔

۲۶ ستمبر ۱۸۹۸ء ندوۃ العلما کی تاریخ میں ایک یادگار دن ہے کہ اس دن دارالعلوم کے ابتدائی درجات کھول دیے گئے اور اکتوبر ۱۸۹۸ کے پہلے ہفتے میں دارالعلوم کا باقاعدہ افتتاح ہوا جس میں ملک کے مشہور علما، مشاہیر اور اکابر نے شرکت کی۔ دارالعلوم ندوہ کے لیے ملک کے مشہور اساتذہ اور علما کی خدمات حاصل کی گئیں، اور آہستہ آہستہ تمام منصوبے اصلاح نصاب، نصاب میں عربی ادب پر زور، انگریزی زبان کی تدریس کی تجاویز روبہ عمل آنے لگیں۔ اس زمانے میں بعض امور کے سلسلے میں اختلافات بھی رونما ہوئے۔ اس سلسلے میں مولانا شبلی نعمانی ایک پارٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔ علمائے بریلی و بدایوں کی مخالفت جاری تھی کہ صوبہ یو پی کا گورنر لارڈ انٹونی میکڈانل ندوہ سے بدگمان ہو گیا، اور آپس کے نزاعات نے اس بدگمانی کے لیے مزید سامان پیدا کر دیا لیکن بعض مخلصین کی کوشش سے یہ مخالفت ختم ہو گئی جن میں نواب وقار الملک کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔

مولانا شبلی نعمانی یوں تو تحریکِ ندوہ میں شروع ہی سے شریک تھے مگر دارالعلوم کے قیام کے بعد ان کی سرگرمیاں اور بڑھ گئیں۔ زمانہ کی ضروریات، عصری تقاضوں اور جدید علوم و افکار پر ان کی گہری نظر تھی، لہٰذا وہ عصری تقاضوں کے تحت بعض ضروری و فوری اصلاحات چاہتے تھے جن سے بعض قدیم طرز کے مدرسین اور علما کو اتفاق نہ تھا۔ بعض امور میں مولانا محمد علی بھی متفق نہ تھے۔ ۱۳۲۱ھ میں ندوہ کے بانی و ناظم مولانا محمد علی مونگیری ندوہ کی نظامت سے سبکدوش ہو گئے اور ۱۹ جولائی ۱۹۰۳ء کو مولانا محمد علی کا استعفا منظور ہو کر پہلا دورِ نظامت ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مولوی مسیح الزمان خاں شاہجہان پوری ناظم مقرر ہوئے جو زیادہ

کامیاب نہ رہے۔

مولانا مسیح الزمان کے بعد ندوۃ العلما کی نظامت اپریل ۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی کے سپرد ہوئی۔ ان کی نظامت سے ندوہ کا دور شروع ہوا۔ مولانا شبلی نعمانی نے نصاب میں پورے طور سے اصلاح کی۔ انگریزی کو لازمی قرار دیا۔ مولانا نے جدید عربی، ہندی اور سنسکرت کی طرف بھی توجہ دی۔ لائق طلبا کی تربیت اور ان کی تحریر و تقریر کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے پر نظر رکھی۔ منتخب اور لائق مدرسین فراہم کیے اور درجۂ اعلیٰ اور درجۂ تکمیل قائم کیے۔ جدید علوم کی تدریس کی طرف دھیان دیا۔ ندوۃ العلما میں ایک اعلیٰ کتب خانہ قائم کیا۔ مولانا شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ "الندوہ" کو ترقی دینا تھا۔ اگرچہ الندوہ کا اجرا اگست ۱۹۰۴ء میں شاہجہان پور سے ہو چکا تھا اور اس کی مجلسِ ادارت میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولانا شبلی تھے۔ اس پرچے میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید علوم کے موازنے اور عربی نصابِ تعلیم کی اصلاح پر بہت سے محققانہ مضامین شائع ہوئے۔ اس کے فاضل مدیران کی فہرست میں مولانا عبداللہ العمادی ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی جیسے حضرات کے نام شامل ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ الندوہ نے اربابِ علم و تحقیق کا ایک اچھا گروہ پیدا کر دیا۔ ۱۹۱۶ء میں یہ ماہنامہ ختم ہو گیا۔

مارچ ۱۹۰۷ء میں دارالعلوم ندوۃ العلما کا پہلا کانووکیشن ہوا جس میں ملک کے نامور علما و مشاہیر نے شرکت کی اور ندوہ کے عملی برکات اور علمی ثمرات دیکھے، ۱۹۰۸ء میں گورنمنٹ یوپی نے پانسو روپے سالانہ ندوہ کو غیر مشروط امداد دی اور ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو لفٹیننٹ گورنر یوپی سرجان پرسکاٹ ہیوٹ نے سنگِ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد ندوہ کی مختلف عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ مولانا شبلی نعمانی کے دورِ نظامت میں ندوہ نے جو ترقی کی، اس کے متعلق مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

> انھوں نے ندوہ کو بے حد فائدہ پہنچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا۔

بعض اختلافات کی وجہ سے مولانا شبلی نعمانی مارچ ۱۹۱۳ء میں مستعفی ہو گئے۔ ندوہ کے لیے

یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ اس کے بعد کچھ دنوں کے لیے مولوی خلیل الرحمن ناظم رہے آخر مارچ ۱۹۱۵ء میں مولانا حکیم عبدالحی ناظم مقرر ہوئے جو اس تحریک میں شروع ہی سے شریک تھے اور ایک مدت سے نائب ناظم تھے۔ یہ نامور عالم مصنف اور مخلص کارکن تھے۔ ان کی تصانیف میں نزہۃ الخواطر اور گل رعنا مشہور ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں حکیم صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد نواب حسن علی خاں اور پھر ڈاکٹر عبدالعلی خان ابن حکیم عبدالحی ناظم مقرر ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مولانا ابوالحسن علی میاں ناظم مقرر ہوئے جو بااحسن وجوہ ندوہ کے فرائض نظامت انجام دے رہے ہیں۔ شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

> مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دور نظامت میں دارالعلوم ندوۃ العلما نے ہر پہلو سے بڑی ترقی کی ہے۔ اس کی شہرت اسلامی ملکوں تک پھیل گئی ہے۔ چنانچہ اس وقت عرب اور افریقہ تک کے طلبا ندوہ میں زیر تعلیم ہیں۔

۱۹۲۰ء میں ندوہ نے تحریک خلافت میں پوری طرح حصہ لیا۔ سید سلیمان ندوی تحریک خلافت کے علم بردار بن گئے۔ اسی طرح ۱۹۲۱ء میں سید سلیمان ندوی تحریک خلافت کے وفد کے ہمراہ حجاز گئے۔ غرض مسلمانوں کی بیداری اور احیاء میں ندوۃ العلما نے ایک مثبت کردار ادا کیا ہے اور ندوۃ العلما کے پیش نظر جو مندرجہ ذیل مقاصد تھے وہ بڑی حد تک پورے ہوئے:

۱۔ مغربی افکار و خیالات اور تہذیب و تمدن کا سیلاب جو مسلمانوں کو اپنی رو میں بہائے لیے جا رہا تھا اس کا مقابلہ کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کی حفاظت اور ان سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یعنی ان کی تعلیمات کو ایسے مؤثر انداز میں پیش کیا جائے کہ لوگ ان کا زیادہ سے زیادہ اخلاقی اثر لیں اور ان کو عملاً اپنی زندگی میں نافذ کریں۔

۳۔ قدیم و جدید دونوں طریقہ تعلیم کی اصلاح کی جائے اور اس کا عملی تجربہ دارالعلوم ندوۃ العلما میں کیا جائے تاکہ قوم میں ایسے تعلیم یافتہ افراد پیدا ہوں جو قوم کی صحیح رہنمائی کر سکیں۔

۴۔ قدیم و جدید طبقوں کی اجنبیت اور علما کی گروہی عصبیت کو مٹا کر ان کے اندر اعتدال

پیدا کیا جائے۔

ندوۃ العلما کا ذکر اس کے (SISTER INSTITUTON) دار المصنفین کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا۔ یہ ادارہ مولانا شبلی نعمانی کے ذہن وخیال کی عملی تصویر ہے۔ مولانا شبلی ایک مصنف اور محقق تھے، وہ دار المصنفین کو دار العلوم ندوۃ العلما کے اندر لکھنؤ میں قائم کرنا چاہتے تھے، جو بعض اختلافات کی وجہ سے قائم نہ ہو سکا۔ بالآخر مولانا شبلی نے اعظم گڑھ میں دار المصنفین کے قیام کا مصمم ارادہ کر لیا۔ دار المصنفین قیام کی منزلوں سے گزر ہی رہا تھا کہ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو شبلی کی کتاب حیات مکمل ہو گئی اور دار المصنفین کو ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی مسلسل جدوجہد اور کوشش سے ملک کا ایک مشہور علمی اور تحقیقی ادارہ بنا دیا جس کی شہرت برصغیر کے حدود سے نکل کر یورپ تک جا پہنچی۔

دار المصنفین کا مشہور علمی وتحقیقی رسالہ "معارف" ۱۹۱۶ء سے جاری ہوا اور آج تک علم وتحقیق کے میدان میں ایک خاص امتیاز واختصاص کا مالک ہے۔ اس نے اردو زبان میں تحقیق کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا۔

دار المصنفین نے علوم اسلامی، سیرت نبویؐ، احوال صحابہ، تاریخ اسلام اور تاریخ ہند پر بڑا گراں قدر کام کیا ہے جس کو علمی حلقوں میں خاص طور سے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

آج کل دار المصنفین کے فعال کارکن مولوی صباح الدین عبدالرحمان صاحب ہیں۔ ان کے علمی وتحقیقی کاموں سے علمی دنیا اچھی طرح متعارف ہے۔